جماعت میں قومی اور ملّی روح پیدا کریں تعلیمِ دین پھیلائیں اور جسمانی و دماغی آوارگی کو روکیں۔

(فرمودہ ۱۰؍فروری ۱۹۳۹ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"مَیں نے پچھلے خطبہ میں اِس امر کا ذکر کیا تھا کہ خدام الاحمدیہ جیسی جماعت کا وجود ایک نہایت ہی ضروری اور اہم کام ہے اور نوجوانوں کی درستی اور اصلاح اور اِن کا نیک کاموں میں تسلسل ایک ایسی بات ہے جسے کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مَیں نے بتایا تھا کہ مستورات کی اصلاح کے لئے لجنہ اماء اللہ کا قیام اور مردوں کی اصلاح کے لئے خدام الاحمدیہ کا قیام گویا دونوں ہی قومی تحریک کے دو بازو ہیں اور تربیت کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری امور میں سے ہیں۔ مَیں نے خدام الاحمدیہ کو توجّہ دلائی تھی کہ اُن کو اپنے کام ایک پروگرام کے ماتحت کرنے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ بغیر پروگرام کے کام کرتے رہیں کیونکہ اِس طرح بغیر پروگرام کے کام کرنے سے چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔

آج مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خدام الاحمدیہ کو اپنے قریب مستقبل میں اور بعید میں بھی بعض باتیں اپنے پروگرام میں شامل کرنی چاہئیں۔ ممکن ہے ان کے سوا بعد میں بعض اور باتیں بھی شامل ہوتی جائیں لیکن مستقبل قریب میں اِنہیں مندرجہ ذیل باتوں پر خاص توجہ کرنی چاہئے۔

اِن میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی اِن کے کام کے ساتھ وابستہ رہنی چاہئیں اور بعض ایسی ہیں جو مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں بدل سکتی ہیں۔ ان کے فرائض میں سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ اپنے ممبروں میں قومی رُوح پیدا کریں۔

''قوم'' کا لفظ آجکل اتنا بدنام ہو چُکا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اِس سے چِڑ جایا کرتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے سامنے کہتا کہ ''ہماری قوم'' تو آپ فرماتے کہ ''ہماری قوم'' کیا ہوتی ہے؟ ''ہمارا مذہب'' کہنا چاہئے لیکن درحقیقت بات یہ ہے کہ جہاں یہ لفظ نسلی امتیاز پر دلالت کرتا ہے وہاں مذہبی امتیاز پر بھی دلالت کرتا ہے۔۔ چنانچہ خود قرآن کریم میں بھی اِس کی مثال موجود ہے۔ جیسا کہ فرمایا اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۱﴾ [1] حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کا اعتراض بوجہ اِس غلط استعمال کے تھا جو آجکل اِس لفظ کا ہو رہا ہے اور جب کسی لفظ کا اِس طرح غلط استعمال عام ہو جائے تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب قوم کا لفظ نسلی یا سیاسی جتّھے کے معنوں میں استعمال ہونے لگے اور مذہب کا جتھہ اِس سے مُراد نہ ہو تو اِس کا یہ استعمال قابلِ اعتراض ہے کیونکہ دُنیا میں اسلام کی غرض یہ ہے کہ تمام سیاسی، نسلی اور اقتصادی جتّھوں کو مٹا دے اور بنی نوع انسان میں ایک عام اخوّت کی تعلیم رائج کرے۔ پس اِس لفظ کے غلط استعمال کی وجہ سے اگر کبھی اِس لفظ کو استعمال سے خارج کر دیا جائے تو یہ کوئی بُری بات نہیں لیکن اپنے وسیع معنوں میں یہ لفظ بُرا نہیں۔

غرض خدام الاحمدیہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ قومی اور ملّی رُوح کا پیدا کرنا ان کے ابتدائی اصول میں سے ہے۔ اِس سال جلسہ سالانہ پر میں نے جو تقریر کی تھی اِس میں بتایا تھا کہ نبوت کی پہلی غرض ملّی رُوح کا پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت اور شریعت کا مرکزی نقطہ ملّی روح کا پیدا کرنا ہی تھا۔ اُس وقت لوگ گناہ سے واقِف نہ تھے اور نہ ہی ثواب کی زیادہ راہیں ابھی تک کھلی تھیں۔

اُس وقت حضرت آدم کی نبوت کی غرض یہی تھی کہ تعاون کی روح جو ایک حد تک اُبھر چکی تھی اُسے مکمل کریں اور اِس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملی رُوح کا سبق وہ سبق ہے جو ہمارے پہلے روحانی باپ نے دیا اور سب سے پہلا الہام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا

وہ ملّی رُوح کے لئے ہی تھا۔ یعنی یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ [۲] اے آدم تُو اور تیرے ساتھی جنت میں رہو یعنی اکٹھے مل کر تعاون کے ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ زَوج کے معنی بیوی کے بھی ہوتے ہیں [۳] مگر ساتھی کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے [۴] حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات میں جہاں یہ لفظ بیوی کے معنوں میں استعمال ہؤا ہے وہاں کئی الہام ایسے ہیں جن میں یہ جماعت کے معنوں میں آیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات دراصل قرآن کریم کی تفسیر ہیں اور الفاظِ قرآنی کے جو معنی اِس زمانہ میں مخفی تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے الہامات میں اِن کا استعمال کر کے وہ معانی ظاہر فرما دیئے ہیں اور اگر کوئی شخص آپ کے الہامات کا مطالعہ کرتا ہے تو قرآن کریم کی تفسیر میں اُس کا علم بہت وسیع ہوسکتا ہے اور آپ کے الہاموں میں زَوج کا لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہؤا ہے۔ کہیں اِس کے معنی بیوی کے ہیں اور کہیں مخلص جماعت کے اور زَوج کے معنوں میں یہ امتیاز معلوم کرنے کے بعد جب اِسے قرآن کریم کی اِس آیت پر چسپاں کریں تو وسیع مطالب کھل جاتے ہیں۔ غرض یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ آدم اور اُس کی بیوی جنت میں رہیں۔ مگر اِس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ آدم اور اُس کے مخلص صحابی ایک جگہ مل کر رہیں اور محبت سے رہیں۔ تعاون کا مفہوم جنت کے لفظ سے نکلتا ہے۔ جنت کی تشریح اسلام نے یہ کی ہے کہ دلوں سے کینہ و بُغض نکال دیا جائے گا اور جب یہ حکم ہو کہ جنت میں رہو تو اِس کے یہ معنی ہوں گے کہ اپنی زندگی میں جنت کی کیفیات پیدا کرو اور باہم تعاون کے ساتھ رہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ سے بچو، جماعتی نظام کو نمایاں کرو اور شخصی وجود کو اِس کے تابع رکھو اور دراصل اِس کے بغیر حقیقی تعاون کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقی تعاون کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ انسان شخصی آزادی کو قُربان کر دے۔ دو شخص اکٹھے چل رہے ہیں۔ ایک تیز چلنے والا ہے اور دوسرا کمزور۔ اب دونوں کے اکٹھا چلنے کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ تیز چلنے والا اپنی رفتار کو کم کر دے اور آہستہ چلنے لگے کیونکہ کمزور تو تیز نہیں چل سکتا۔ ایک بوڑھا جو لاٹھی ٹیک کر چلتا ہے اور ایک تیز چلنے والا نوجوان اکٹھے چلیں اور بوڑھا یہ اُمید رکھے کہ نوجوان آہستہ چلے اور نوجوان یہ کہ

بوڑھا تیز چلے تا دونوں اکٹھے چل سکیں تو تم سمجھ سکتے ہو کہ دونوں میں سے کس کی اُمید جائز سمجھی جائے گی۔ یقیناً بوڑھے کی کیونکہ بوڑھا اگر کوشش بھی کرے تو بھی تیز نہیں چل سکتا لیکن نوجوان آہستہ چل سکتا ہے اور اگر چاہے تو اپنی رفتار کو سُست کر کے بوڑھے کو ساتھ لے جا سکتا ہے اور اِس لئے دونوں میں سے وہی مطالبہ صحیح ہو سکتا ہے جو ممکن ہے۔ نوجوان اگر یہ مطالبہ کرے کہ بوڑھا تیز چل کر اِس کے ساتھ ملے تو اِس کا یہ مطالبہ بے وقوفی کا مطالبہ سمجھا جائے گا کیونکہ تیز چلنا بوڑھے کے لئے ممکن ہی نہیں۔ ہاں وہ خود تیز چلنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی آہستہ چل سکتا ہے لیکن جب یہ ایسا کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنی آزادی پر قید لگاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اِسے طاقت دی ہے کہ چار پانچ میل ایک گھنٹہ میں طے کر جائے مگر چونکہ اِس کا ساتھی بوڑھا ہے اور پون میل سے زیادہ نہیں چل سکتا اِس لئے یہ بھی اپنی رفتار اِتنی ہی کر لیتا ہے اور اتنا ہی چلتا ہے۔ اِس کا اتنی کم رفتار سے چلنا اس کی اپنی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس وجہ سے ہے کہ اپنے بوڑھے اور کمزور ساتھی کو بھی ساتھ لے جا سکے اور یہی حقیقی تعاون ہے کہ انسان کو اختیار اور طاقت حاصل ہو، رُتبہ حاصل ہو، روپیہ موجود ہو مگر وہ اُن کے متعلق اپنے اختیارات پر خود قیدیں لگا دے۔ روپیہ خرچ کرنے کے لئے موجود ہو مگر کم خرچ کرے یا اُسے دوسروں کے لئے خرچ کرنے لگے۔ موجود ہونے کے باوجود کم خرچ کرنے کی مثال روزہ ہے اور دوسروں کی خاطر خرچ کرنے کی مثال صدقہ ہے۔ روزہ میں کم خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک امیر آدمی بھی سب کچھ موجود ہونے کے باوجود اپنی شکل غریبوں کی سی بناتا ہے۔ دراصل سحری کی غرض یہی ہے کہ انسان جو بھی کھاتا ہے چوری چھُپے کھاتا ہے اور جب لوگوں کے سامنے آتا ہے تو ایسی حالت میں کہ اِس کے چہرہ سے فاقہ کشی اور غربت کے آثار ہویدا ہوتے ہیں اور اِس طرح وہ جسے کھانے کو ملتا ہے اور وہ بھی جسے نہیں ملتا سب یکساں نظر آتے ہیں۔ جو کچھ کھانا ہوتا ہے وہ سحری کے وقت ہی کھا لیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کے سامنے آنے کے وقت سب کی شکلیں غربت ظاہر کر رہی ہوتی ہیں۔ حج کی بھی یہی صورت ہے سب کے لئے حکم ہے کہ ایک چادر لپیٹ لو اور اِس طرح لباس میں سب تکلّفات، کوٹ، صدری، قمیص، بنیان وغیرہ اُڑ گئیں۔ پھر اِس چادر کی سلائی کو بھی روک دیا کیونکہ سب فیشن دراصل سلائی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ صرف ایک

کپڑا پہننے کی اجازت ہے اور سب کے لئے یہی حکم ہے۔ اِس طرح ہماری شریعت نے دونوں رنگ رکھے ہیں۔ کہیں تو کم خرچ کرنے کو کہا ہے اور کہیں دوسروں کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ روپیہ موجود ہے مگر انسان اس کا استعمال نہیں کرسکتا اِس لئے کہ اپنے غریب یا نادار بھائی کے مشابہہ نظر آ سکے۔ یا چیز موجود ہے مگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ دوسرے کو دے دو اور اِسی کا نام ملّی روح ہے۔ یعنی اپنی طاقتوں کو اور ذرائع کو مقیّد اور محدود کر دیا جائے اور اِس ملّی روح کے کمال کا نقطہ یہ ہے کہ انسان کے اندر یہ بات پیدا ہو جائے کہ جہاں میری ذات کا مفاد میری قوم کے مفاد سے ٹکرائے وہاں قومی مفاد کو مقدّم کروں گا اور اپنی ذات کو نظر انداز کر دوں گا اور جب کسی جماعت میں یہ بات پیدا ہو جائے تو وہ کسی سے ہارتی نہیں۔ صحابہ کرامؓ کی حالت ہمارے سامنے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے لئے صحابہ جو قُربانیاں کرتے تھے وہ بھی دراصل اسلام کے لئے ہی تھیں کیونکہ وہ آپ کو اسلام کا مکمل نمونہ خیال کرتے تھے اور اِس لئے آپ کے مقابلہ میں اپنی شخصیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔ مذہبی جماعتوں میں تو رُوح بہت بڑی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیوی قوموں میں بھی جب یہ بات پیدا ہو جائے تو وہ بہت ترقی کر جاتی ہیں۔ آج کل دیکھ لو انگلستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی یہ موضوع زیرِ بحث آتا رہتا ہے کہ عورت کا کام کیا ہے؟ بڑے بڑے لوگ ہمیشہ اِس پر اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں مگر کیا مجال جو کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھے۔ اگر کوئی شخص ایسی بات کہہ دے تو ایک طرف عورتیں اِس کے پیچھے پڑ جائیں گی کہ یہ ہماری آزادی کا دُشمن ہے اور دوسری طرف اخبارات میں مرد اُسے غیر مہذب اور غیر متمدن کہیں گے لیکن جرمنی میں ہٹلر نے کہہ دیا کہ عورت کا کام یہ ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھے اور سب نے اِسے تسلیم کرلیا۔ جو بات یہاں ہندوستان میں جو ایک غلام مُلک ہے کہنے کی کوئی جُرأت نہیں کرتا وہ ایک آزاد مُلک میں کہی گئی اور سب نے اِسے بِلا چُون و چرا تسلیم کرلیا۔ حالانکہ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ یورپ میں اِس کا سمجھنا بالکل ناممکن ہے کہ عورت گھر میں کس طرح رہ سکتی ہے مگر ہٹلر نے جو حکم دیا اُسے سب نے تسلیم کیا اور عمل کیا۔ اگرچہ کوئی ایسا طبقہ ہوسکتا ہے جو دل سے اِس خیال کے ساتھ متفق نہ ہو مگر یہ جُرأت کسی کو نہیں ہوئی

کہ مقابلہ پر آئے۔ یہاں بڑے بڑے شہروں مثلاً لاہور، دہلی شملہ میں آئے دن عورت مرد کی مساوات کا شور رہتا ہے۔ مساوات کے یوں تو سب ہی قائل ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ مساوات ہے کس معاملہ میں؟ حضرت خلیفہ اوّل سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ جموں میں ایک جج اِسی موضوع پر اُن سے بحث کرنے لگا کہ مرد عورت میں مساوات ہونی ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پچھلی مرتبہ آپ کی بیوی کے لڑکا ہؤا تھا اب کے آپ کے ہونا چاہئے۔ یہ جواب سُن کر وہ کہنے لگا کہ مَیں نے سُنا ہؤا تھا مولوی بدتہذیب ہوتے ہیں مگر مَیں آپ کو ایسا نہ سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہؤا کہ آپ بھی ایسے ہی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اِس میں بدتہذیبی کی کوئی بات نہیں۔ مَیں نے تو ایک مثال دی تھی اور آپ کو بتایا تھا کہ جب فطرت نے دونوں کو الگ الگ کاموں کے لئے پیدا کیا ہے تو اِس مساوات کے شور سے کیا فائدہ؟ تھی تو یہ سچائی مگر ایسے ننگے طور پر پیش کی گئی کہ اُسے بُری لگی اور شائد اُس کے حالات کے لحاظ سے حضرت خلیفہ اوّل کے لئے اِس کے سِوا چارہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مساوات بے شک ہے مگر دونوں کے کام الگ الگ ہیں۔ اِس بات کو پیش کرنے کی کسی کو جُرأت نہیں ہوتی کیونکہ قومی رُوح موجود نہیں۔ ہر شخص اپنی ذات کو دیکھتا ہے۔ اگر عورتوں کے لئے یہ قُربانی ہے کہ وہ گھروں میں رہیں تو مرد کے لئے بھی اِس کے مقابلہ میں یہ بات ہے کہ میدانِ جنگ میں جا کر سر کٹوائے لیکن چونکہ قومی اور ملّی رُوح موجود نہیں اِس لئے اِن باتوں کو کوئی پیش کرنے کی جُرأت نہیں کرتا۔

پس خدام الاحمد یہ اِس بات کو اپنے پروگرام میں خاص طور پر ملحوظ رکھیں کہ قومی اور ملّی روح کا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اصولی طور پر ہر ایک سے یہ اقرار لیا جائے اور اِسے بار بار دُہرایا جائے۔ محض اقرار کافی نہیں ہوتا بلکہ بار بار دُہرانا اشد ضروری ہوتا ہے۔ آج علم النّفس کے ماہر اِس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ دوہرانے سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے لیکن اِن کی یہ بات جب مَیں پڑھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح آج سے چودہ سَو سال قبل اسلام نے اِسی بات کو پیش کیا ہے۔ اسلام ہی ہے جس نے نہایت مختصر الفاظ میں مذہب کا خلاصہ پیش کر دیا۔ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کیا ہے؟ یہ اسلامی تعلیم کا خلاصہ ہے اور جب مَیں علم النفس کا یہ مسئلہ پڑھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ یہ لوگ

آج تحقیقاتیں کر رہے ہیں۔ ہٹلر آج کہتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سَو سال قبل یہ نکتہ بتا دیا تھا۔ ہٹلر نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ مَیں نے قومی ترقی کے ذرائع پر بڑا غور کیا اور آخر مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ قومی ترقی کے اسباب کو تھوڑے سے تھوڑے لفظوں میں بیان کرنا چاہئے جو بار بار لوگوں کے سامنے آتے رہیں اور وہ انہیں بار بار دُہراتے رہیں۔ اِس طرح وہ انسانی دماغ میں جذب ہو جائیں گے لیکن اسلام میں یہ بات پہلے ہی سے موجود ہے۔ **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ** کیا ہے؟ یہ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اِسے نمازوں میں اذانوں میں، اسلام لانے کے وقت غرضیکہ بار بار دُہرانے کا حکم ہے اور اِس طرح بار بار جو چیز دُہرائی جائے وہ زیادہ سے زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔

پس خدام الاحمدیہ کو بھی چاہئے کہ اِن کو چھوٹے سے چھوٹے فقروں میں لائیں اور پھر ہر میٹنگ کے موقع پر بار بار اِن کو دُہرایا جائے۔ مثلاً یہ فقرہ ہوسکتا ہے کہ مَیں اپنی جان کی اسلامی اور ملّی فوائد کے مقابلہ میں کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔ جب کوئی مجلس ہو ہر شخص باری باری پہلے اِسے دُہرائے اور پھر کام شروع ہو۔ اِسی طرح جب ختم ہو تو بھی اِسے دُہرایا جائے اور اِس طریق سے یہ بات دماغ میں جذب ہوسکتی ہے۔ بعض نادان خیال کر لیتے ہیں کہ قواعد میں کوئی بات رکھ دینا ہی کافی ہوتا ہے اور اِس طرح وہ دل میں داخل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ایسا ہوسکتا تو اسلام کی تعلیم کے خلاصہ کے بار بار دُہرائے جانے کا حکم دینے کی کیا ضرورت تھی؟

پس اِس قسم کا کوئی فقرہ بنایا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ بار بار دُہرایا جاتا رہے مثلاً یہ کہ میں جماعتی اور ملّی ضرورتوں کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور کسی چیز کی کوئی پروا نہ کروں گا۔ اور پھر ایسا انتظام ہو کہ اِسے بار بار دُہرایا جائے۔ ایسے فقروں کو بار بار دُہرانے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ذہنیتوں میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ بعض اوقات مخلصوں میں بھی بغاوت کا جو مادہ پیدا ہو جاتا ہے اُس کا احتمال نہیں رہے گا۔ دیکھو اسلام نے **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ** کو بار بار دُہرانے کا جو حکم دیا ہے اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کوئی مسلمان یہ نہیں کہے گا کہ مَیں خدا کو نہیں مانتا یا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں مانتا۔ آپ کو

کئی ایسے مسلمان ملیں گے جو کہہ دیں گے کہ جاؤ مَیں روزہ نہیں رکھتا، مَیں نماز نہیں پڑھتا مگر ایسا کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو نہیں ملے گا جو کہے کہ مَیں خدا کو نہیں مانتا یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا۔ اِس لئے کہ نماز اور روزہ کی تعلیم بار بار اِس کے سامنے دُہرائی نہیں گئی مگر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بار بار دُہرایا جاتا رہا ہے۔ پس خدام الاحمدیہ انفرادی رُوح کی ملّی روح پر قُربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے تمام ذرائع استعمال کریں اور اِس کے لئے کوئی موزوں فقرہ بھی بنایا جائے جو کام شروع کرتے وقت بھی اور ختم کرتے وقت بھی دُہرایا جائے اور نعرے بھی لگائے جائیں لیکن ایک بات کا خیال رکھا جائے کہ قومی رُوح توحیدِ باری کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ اِس لئے ایسے فقرہ میں توحید کا اقرار بھی ہو اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کا بھی اور پھر وہ چھوٹا بھی ہو اور ہر موقع پر اُسے بار بار دُہرانے کا انتظام بھی کیا جائے۔ پھر جب بھی کوئی جماعتی تحریک ہو وہ اپنے نوجوانوں کا جائزہ لیتے رہیں کہ اِس میں اُنہوں نے کیا حصّہ لیا ہے۔ سب اپنے اپنے ہاں کام کریں مگر ان سب سے رپورٹ لی جائے کہ کیا کیا ہے؟ اِس طرح بھی کام کرنے کی ایک رَو پیدا ہوتی ہے اور پہلے جو غفلت کر رہے ہوتے ہیں اُن کو بھی توجّہ پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسری بات جو اُنہیں اپنے پروگرام میں شامل کرنی چاہئے وہ اسلامی تعلیم سے واقفیت پیدا کرنا ہے۔ یہ ایک مذہبی انجمن ہے سیاسی نہیں اور اِس لئے اصل پروگرام یہی ہے باقی چیزیں تو ہم حالات اور ضروریات کے مطابق لے لیتے یا ملتوی کر دیتے ہیں لیکن ہمارا اصل پروگرام تو وہی ہے جو قرآن کریم میں ہے۔ لجنہ اماء اللہ ہو، مجلس انصار ہو، خدام الاحمدیہ ہو، نیشنل لیگ ہو، غرض کہ ہماری کوئی انجمن ہو اس کا پروگرام قرآن کریم ہی ہے اور جب ہر ایک احمدی یہی سمجھتا ہے کہ قرآن کریم میں سب ہدایات دے دی گئی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مُضِرّ نہیں تو اس کے سِوا اَور کوئی پروگرام ہو ہی کیا سکتا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ اصل پرگرام تو وہی ہے۔ اِس میں سے حالات اور اپنی ضروریات کے مطابق بعض چیزوں پر زور دے دیا جاتا ہے لیکن جب روزے رکھے جا رہے ہوں تو اُس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ حج منسوخ ہو گیا بلکہ چونکہ وہ دن روزوں کے ہوتے ہیں اس لئے روزے رکھے جاتے ہیں۔ جب ہم کوئی پروگرام تجویز کرتے ہیں

تو اِس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اِس وقت یہ امراض پیدا ہو گئے ہیں اور اِن کے لئے یہ قرآنی نسخے ہم استعمال کرتے ہیں اور یہ اِسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ سارا پروگرام سامنے ہو اور اِس میں سے حالات کے مطابق باتیں لے لی جائیں لیکن اگر سارا پروگرام سامنے نہ ہو تو اس کا ایک نقص یہ ہوگا کہ صرف چند باتوں کو دین سمجھ لیا جائے گا۔

پس خدام الاحمدیہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے ممبروں میں قرآن کریم باترجمہ پڑھنے اور پڑھانے کا انتظام کریں اور چونکہ وہ خدام الاحمدیہ ہیں صرف اپنی خدمت کے لئے ان کا وجود نہیں۔ اِس لئے جماعت کے اندر قرآن کریم کی تعلیم کو رائج کرنا اِن کے پروگرام کا خاص حصّہ ہونا چاہیئے۔ تیسری بات جو اِن کے پروگرام میں ہونی چاہیئے وہ آوارگی کا مٹانا ہے۔ آوارگی بچپن میں پیدا ہوتی ہے اور یہ سب بیماریوں کی جڑ ہوتی ہے اِس کی بڑی ذمّہ داری والدین اور استادوں پر ہوتی ہے۔ وہ چونکہ احتیاط نہیں کرتے اِس لئے بچے اِس میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اِس کے مٹانے کے لئے کتنا انتظام کیا ہے کہ فرمایا بچے کے پیدا ہوتے ہی اِس کے کان میں اذان اور تکبیر کہی جائے[5] اور اِس طرح عمل سے بتا دیا کہ بچہ کی تربیت چھوٹی عمر سے شروع ہونی چاہیئے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ بچوں کو مساجد اور عیدگاہوں میں ساتھ لے جانا چاہیئے۔[6] خود آپ کا اپنا طریق بھی یہی تھا۔ آجکل تو یہ حالت ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان بھی بیہودہ حرکت کریں تو والدین کہہ دیتے ہیں کہ ابھی ''نیانا'' یعنی کم عمر ہے لیکن ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ حدیثیں سُناتے ہیں جبکہ اُن کی عمر صرف تیرہ سال کی ہے۔ امام مالک کے درس میں امام شافعی شریک ہونے کے لئے گئے اُن کے درس میں بیٹھنے کے لئے یہ ضروری شرط تھی کہ طالبعلم قلم دوات لے کر بیٹھے اور جو کچھ وہ بتائیں نوٹ کرتا جائے۔ امام شافعی کی عمر اُس وقت صرف نو سال کی تھی۔ امام مالکؒ[8] نے اِنہیں بیٹھے دیکھا تو کہا بچے تم کیوں بیٹھے ہو؟ امام شافعی نے جواب دیا کہ درس میں شامل ہونے کے لئے آیا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ اب تک کیا پڑھا ہے؟ اُنہوں نے بتایا کہ یہ یہ پڑھ چُکا ہوں۔ اِس پر امام مالکؒ نے کہا کہ تم بہت کچھ پڑھ چکے ہو مگر میرے درس میں بیٹھنے کا یہ طریق نہیں۔ یہاں تو قلم دوات لے کر بیٹھنا چاہیئے۔ امام شافعی نے کہا کہ مَیں کل بھی بیٹھا تھا آپ

دوسرے طلباء سے مقابلہ کرالیں۔ امام صاحب نے سوال کیا اور اُنہوں نے ٹھیک جواب دیا۔ امام صاحب کی عادت تھی کہ اگلے روز نوٹوں کو سُنتے اور کوئی غلطی ہوتی تو اُس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ اس دن جو اُنہوں نے گزشتہ نوٹ سُننے شروع کئے تو جب پڑھنے والا غلطی کرتا امام شافعی جھٹ اس کو ٹوک دیتے کہ امام صاحب نے یوں نہیں بلکہ یوں فرمایا تھا۔ چنانچہ امام مالک نے اُن کو بغیر قلم دوات کے اپنے درس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی حالانکہ اَور کسی کو اِس کی اجازت نہ تھی۔ یہ بات کیوں تھی؟ اِس لئے کہ ماں باپ نے شروع میں ہی اِن کو علم کے حصول میں لگا دیا تھا مگر ہمارا ''نیانا پن'' یعنی بچپن اٹھارہ بیس سال تک نہیں جاتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں عمر کے دو ہی حصّے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک وہ جب بچہ سمجھا جاتا ہے اور ایک وہ جب وہ بے کار بوڑھا ہوتا ہے اور اِس طرح کام کا کوئی وقت آتا ہی نہیں۔ ایک دفعہ ایک عورت جس کی عمر کوئی پینسٹھ سال کی ہو گی مجھ سے کوئی بات کر رہی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ ''ساڈے یتیماں تے رحم کرو'' یعنی ہم یتیموں پر رحم کریں۔ یہ کوئی پانچ سات سال کی بات ہے اور اِس وقت اِس کی عمر ۶۵ سال کی ہو گی تو گویا ہمارے ہاں یا تو آدمی بچہ ہوتا ہے اور یا پیر فرتوت جسے پنجابی میں سترا بہترا کہتے ہیں۔ یہ بہت حماقت کی بات ہے کہ بچوں کو چھوٹا سمجھ کر انہیں آوارہ ہونے دیا جائے۔ اگر بچوں سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو وہ کبھی آوارہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر انہیں گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرنے کی بجائے مجلسوں میں بٹھایا جائے تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میری تعلیم کچھ بھی نہ تھی لیکن یہ بات تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مجلس میں جا بیٹھتا تھا، حضرت خلیفہ اوّل کی مجلس میں چلا جاتا تھا، کھیلا بھی کرتا تھا۔ مجھے شکار کا شوق تھا، فٹ بال بھی کھیل لیتا تھا لیکن گلیوں میں بیکار نہیں پھرتا تھا بلکہ اُس وقت مجلسوں میں بیٹھتا تھا اور اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑی بڑی کتابیں پڑھنے والوں سے میرا علم خدا تعالیٰ کے فضل سے زیادہ تھا۔ علم گدھوں کی طرح کتابیں لاد لینے سے نہیں آجاتا۔ آوارگی کو دور کرنے سے علم بڑھتا ہے اور ذہن میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔

پس اَساتذہ، افسرانِ تعلیم اور خدام الاحمدیہ کا یہ فرض ہے کہ بچوں سے آوارگی کو دُور کریں یہ آوارگی کا ہی اثر ہے کہ اِدھر ہم نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں اور اُدھر گلی میں بچے گالیاں بک رہے

ہوتے ہیں ۔ اگر تو وہ نماز ہی نہیں پڑھتے تو دُہرے مُجرم ہیں ۔نہیں تو یہی جُرم کافی ہے ، فحش گالیاں ماں بہن کی وہ بکتے ہیں اور کسی شریف آدمی کو خیال نہیں آتا کہ اُن کو روکے ۔ مسجد مبارک کے سامنے کھیلنے والے بچے ۹۰، ۹۵ فیصدی احمدیوں کے بچے ہی ہو سکتے ہیں ۔ تھوڑے سے غیروں کے بھی ہوتے ہوں گے مگر مَیں نے اپنے کانوں سے سُنا ہے احمدیوں کے بچے گالیاں دے رہے ہوتے ہیں اور اُن کے ماں باپ اور اساتذہ کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اُن کی اصلاح کریں ۔ پھر مَیں نے دیکھا ہے مدرسہ احمدیہ کے طلباء گلیوں میں سے گزرتے ہیں تو گاتے جاتے ہیں ۔ حالانکہ یہ وقار کے سخت خلاف ہے اور اِس کے یہ معنے ہیں کہ شرم و حیا جو دین کا حصّہ ہے بالکل جاتی رہی ہے ۔ پھر مَیں نے دیکھا ہے نوجوان ایک دوسرے کی گردن میں باہیں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہیں ۔ حالانکہ یہ سب باتیں وقار کے خلاف ہیں ۔ مجھے یاد ہے میرا ایک دوست تھا بچپن میں ایک دفعہ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے کہ حضرت خلیفہ اوّل نے دیکھا ۔ میری تو آپ بہت عزّت کیا کرتے تھے اِس لئے مجھے تو کچھ نہ کہا لیکن اُس کو اِس قدر ڈانٹا کہ مجھے بھی سبق حاصل ہو گیا ۔ ہمارے مُلک میں کہتے ہیں کہ ’’ تی اے نی مَیں تینوں کہاں نُو ایں نی تُوں گن رکھ ‘‘ ۔ یعنی بات تو مَیں اپنی لڑکی سے کہتی ہوں مگر بہو اِسے غور سے سُنے ۔ اِسی طرح حضرت خلیفہ اوّل نے اُسے ڈانٹا مگر مجھے بھی سبق ہو گیا کہ یہ بری بات ہے ۔

مَیں نے دیکھا ہے کہ نوجوانوں کو اسلامی آداب سکھانے کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی ۔ نوجوان بے تکلفّانہ ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈالے پھر رہے ہوتے ہیں حتّٰی کہ میرے سامنے بھی ایسا کرنے میں انہیں کوئی باک نہیں ہوتا ۔ کیونکہ اُن کو یہ احساس ہی نہیں کہ یہ کوئی بُری بات ہے ۔ اِن کے ماں باپ اور اَساتذہ نے اِن کی اصلاح کی طرف کبھی کوئی توجہ ہی نہیں کی ۔ حالانکہ یہ چیزیں انسانی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں ۔ مَیں نے دیکھا ہے بعض لوگوں کی بچپن میں تربیت کا اب تک مجھ پر اثر ہے اور جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار اُن کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے ۔ ایک دفعہ میں ایک لڑکے کے کندھے پر کُہنی ٹیک کر کھڑا تھا کہ ماسٹر قادر بخش صاحب نے جو مولوی عبدالرحیم صاحب دردؔ کے والد تھے اِس سے منع کیا اور کہا کہ یہ بہت بُری بات ہے ۔

اُس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی لیکن وہ نقشہ جب بھی میرے سامنے آتا ہے اُن کے لئے دِل سے دُعا نکلتی ہے۔

اِسی طرح ایک صوبیدار صاحب مُراد آباد کے رہنے والے تھے اُن کی ایک بات بھی مجھے یاد ہے۔ ہماری والدہ چونکہ دِلّی کی ہیں اور دِلّی بلکہ لکھنؤ میں بھی ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بزرگوں کو بے شک آپ کہتے ہیں لیکن ہماری والدہ کے کوئی بزرگ چونکہ یہاں تھے نہیں کہ ہم اِن سے ''آپ'' کہہ کر کسی کو مخاطب کرنا بھی سیکھ سکتے۔ اِس لئے مَیں دس گیارہ سال کی عمر تک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ''تم'' ہی کہا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ان کے مدارج بلند کرے۔ صوبیدار محمد ایوب خان صاحب مُراد آباد کے رہنے والے تھے۔ گورداسپور میں مقدمہ تھا اور مَیں نے بات کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو تم کہہ دیا۔ وہ صوبیدار صاحب مجھے الگ لے گئے اور کہا کہ آپ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فرزند ہیں اور ہمارے لئے محلِّ ادب ہیں لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ ''تم'' کا لفظ برابر والوں کے لئے بولا جاتا ہے بزرگوں کے لئے نہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لئے اِس کا استعمال مَیں بالکل برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ پہلا سبق تھا جو اُنہوں نے اِس بارہ میں مجھے دیا۔ پس بڑوں کا فرض ہے کہ چھوٹوں کو یہ آداب سکھائیں۔ اگر ایک ہی شخص کہے تو ان پر اثر نہیں ہوتا۔ بچے سمجھتے ہیں یہ ضدی سا آدمی ہے یونہی ایسی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اگر باپ کہے اور ماں نہ کہے تو سمجھتے ہیں باپ ظالم ہے۔ اگر یہ اچھی بات ہوتی تو ماں کیوں نہ کہتی۔ اگر ماں باپ کہیں اور اُستاد نہ کہے تو سمجھتے ہیں اگر یہ اچھی بات ہوتی تو اُستاد کیوں نہ کہتا اور اگر اُستاد بھی کہے اور دوسرا کوئی نہ کہے تو سمجھتے ہیں اگر یہ اچھی بات ہوتی تو کوئی دوسرا شخص کیوں نہ کہتا لیکن اگر ماں باپ بھی کہیں، اُستاد بھی کہیں اور دوسرے لوگ بھی کہتے رہیں تو وہ بات ضرور دِل میں راسخ ہو جاتی ہے۔

ایک چھوٹا سا ادب خطبہ کو توجہ سے سُننا ہے اور مَیں کئی بار اِس کی طرف توجہ بھی دِلا چُکا ہوں مگر مَیں نے دیکھا ہے لوگ برابر باتیں اور اشارے کرتے رہتے ہیں اور اَساتذہ یا دوسرے لوگ کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ڈالتے کہ جس سے اصلاح ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عادت ہمیشہ ہی چلتی چلی جاتی ہے۔ ایک دفعہ مَیں نے دیکھا مَیں خطبہ پڑھ رہا تھا۔ ایک شخص کو مَیں قریباً

پندرہ منٹ تک دیکھتا رہا کہ وہ اپنے ایک بعد میں آنے والے دوست کو برابر اشارے کرتا رہا کہ آگے آ جاؤ۔ اگر بچپن میں ماں باپ یا اُستاد یا دوسرے لوگ اُسے یہ بتاتے کہ یہ ناجائز ہے اور کہ جب تمہاری اپنی ہدایت کا سوال پیدا ہو جائے تو دوسرے کو گمراہی سے بچانے کا موقع نہیں ہوتا تو وہ اِس گناہ کا مُرتکب نہ ہوتا۔ یہ اِس جوش کی وجہ سے کہ دوست آگے آ جائے اور خطبہ سُن لے اُسے اشارے کرتا تھا لیکن وہ شرم کی وجہ سے آگے نہ بڑھتا تھا اور اگر یہ مسئلہ بچپن سے ہی اِس کے ذہن نشین ہوتا تو کبھی دوسری طرف اِس کی نظر ہی خطبہ کے دوران میں نہ اُٹھتی اور اِس طرح کسی کو اشارے کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور یہ دوسرے کی ہدایت کے جوش میں خود گمراہی کا مُرتکب نہ ہوتا۔ یہ تربیت سے تعلق رکھنے والے مسائل ہیں اور اِن سے آوارگی دور ہوتی ہے۔ پھر بچہ کو بروقت کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھنا چاہیئے۔ مَیں کھیل کو بھی کام ہی سمجھتا ہوں یہ کوئی آوارگی نہیں۔ آوارگی میرے نزدیک فارغ اور بیکار بیٹھنے کا نام ہے یا اِس چیز کا کہ بانہوں میں بانہیں ڈال لیں اور گلیوں میں پھرتے رہے۔ اِس بات کا اچھی طرح خیال رکھنا چاہیئے کہ بچے یا پڑھیں یا کھیلیں یا کھائیں اور یا سوئیں، کھیل آوارگی نہیں۔ اِس لئے اگر وہ دس گھنٹے بھی کھیلتے ہیں تو کھیلنے دو۔ اِس سے ان کا جسم مضبوط ہوگا اور آوارگی بھی پیدا نہ ہوگی۔ پس کھیلنا بھی ایک کام ہے جس طرح کھانا اور سونا بھی کام ہے مگر خالی بیٹھنا اور باتیں کرتے رہنا آوارگی ہے۔ اِس لئے خدام الاحمدیہ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ جماعت کے بچوں میں یہ آوارگی پیدا نہ ہو۔ کسی کو یونہی پھرتے دیکھیں تو اِس سے پوچھیں کہ کیوں پھر رہا ہے۔ اگر باز نہ آئے تو محلّہ کے پریذیڈنٹ کو رپورٹ کریں اور ان سب باتوں کے لئے اصول وضع کریں جن کے ماتحت کام ہو۔ مَیں نے دیکھا ہے کئی لوگ گھنٹوں دکانوں پر بیٹھے فضول باتیں کرتے رہتے ہیں حالانکہ اگر اُسی وقت کو وہ تبلیغ میں صرف کریں تو کئی لوگوں کو احمدی بنا سکتے ہیں لیکن فضول وقت ضائع کر دیتے ہیں اور اگر کام کے لئے پوچھا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ فُرصت نہیں۔ حالانکہ اگر فُرصت نہیں ہوتی تو دکانوں پر کس طرح بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں؟ ایک اَور ذریعہ اصلاح کا یہ بھی ہے کہ بیٹھ کر علمی اور دینی باتیں کی جائیں۔ اچھے انداز میں گفتگو کرنا بھی ایک خاص فن ہے۔ ایسی مجلسوں میں علمی اور دینی باتیں ہوں لیکن بحث مباحثہ نہ ہو۔ اس چیز کو بھی مَیں آوارگی

سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ دل پر زنگ لگانے والی ہے۔ مباحثہ کرنے والوں کے مدّ نظر تقویٰ نہیں بلکہ مدّ مقابل کو چُپ کرنا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مَیں ہمیشہ مباحثات سے بچتا ہوں اور میری تو یہ عادت ہے کہ اگر کوئی مباحثانہ رنگ میں سوال کرے تو ابتدا میں ایسا جواب دیتا ہوں کہ کئی لوگوں نے کہا ہے کہ اُنہوں نے کسی سوال پر پہلے پہل میرا جواب سُن کر یہ خیال کیا کہ شائد میں جواب نہیں دے سکتا اور دراصل ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر جب کوئی پیچھے ہی پڑ جائے تو مَیں جواب کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا جواب دیتا ہوں کہ وہ بھی اپنی غلطی محسوس کر لیتا ہے۔ یاد رکھو سچائی کے لئے کسی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مَیں نے ہمیشہ ایسی باتوں سے روکا ہے۔ ڈیبیٹنگ کلبیں بھی میرے نزدیک آوارگی کی ایک شاخ ہے اور مَیں اِس سے ہمیشہ روکتا رہتا ہوں لیکن یہ چیز بھی کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ برابر جاری ہے حالانکہ اِس سے دل پر سخت زنگ لگ جاتا ہے۔ ایک شخص کسی چیز کو مانتا نہیں مگر اِس کی تائید میں دلائل دیتا جاتا ہے تو اِس سے دِل پر زنگ لگنا لازمی امر ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریق ایمان کو خراب کرنے والا ہے۔ مولوی محمد احسن صاحب امروہی نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو سُنایا کہ مولوی بشیر صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بہت مؤیّد اور مَیں مخالف تھا۔ مولوی بشیر صاحب ہمیشہ دوسروں کو براہین احمدیہ پڑھنے کی تلقین کرتے اور کہا کرتے تھے کہ یہ شخص مجدد ہے۔ آخر مَیں نے ان سے کہا کہ آؤ مباحثہ کر لیتے ہیں مگر آپ تو چونکہ مؤیّد ہیں، آپ مخالفانہ نقطۂ نگاہ سے کتابیں پڑھیں اور مَیں مخالف ہوں اِس لئے موافقانہ نقطہ نگاہ سے پڑھوں گا۔ سات آٹھ دن کتابوں کے مطالعہ کے لئے مقرر ہو گئے اور دونوں نے کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ مَیں جو مخالف تھا احمدی ہو گیا اور وہ جو قریب تھے بالکل دُور چلے گئے۔ اِن کی سمجھ میں بات آ گئی اور اِن کے دل سے ایمان جاتا رہا۔ تو علم النفس کے رو سے ڈیبیٹس کرنا سخت مُضِر ہے اور بعض اوقات سخت نقصان کا موجب ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے باریک مسائل ہیں جن کو سمجھنے کی ہر مدرّس اہلیت نہیں رکھتا۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہؤا یہاں ایک ڈیبیٹ ہوئی اور جس کی شکایت مجھ تک بھی پہنچی تھی اِس میں اِس امر پر بحث تھی کہ ہندوستان کے لئے مخلوط انتخاب چاہئے یا جُداگانہ؟ حالانکہ مَیں

اِس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں اور یہ سُوءِ ادبی ہے کہ اِس بات کا علم ہونے کے باوجود کہ مَیں ایک امر کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر چُکا ہوں پھر اِس کو زیرِ بحث لایا جائے۔ جن امور میں خدا تعالیٰ یا اُس کے رسول یا اُس کے خلفاء اظہارِ رائے کر چکے ہوں ان کے متعلق بحث کرنا گستاخی اور بے ادبی میں داخل ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو محض کھیل ہے لیکن کیا کوئی کھیل کے طور پر اپنے باپ کے سر میں جوتیاں مار سکتا ہے۔ تو ڈیبیٹس سے زیادہ حماقت کی کوئی بات نہیں۔ ہر احمدی وفاتِ مسیح کا قائل ہے مگر ڈیبیٹ کے لئے بعض حیاتِ مسیح کے دلائل دینے لگتے ہیں۔ مَیں تو ایسے شخص سے یہی کہوں گا کہ بے حیا خدا تعالیٰ نے تجھے ایمان دیا تھا مگر تو کُفر کی چادر اوڑھنا چاہتا ہے۔ پس یہ ڈیبیٹس بھی آوارگی میں داخل ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے تمہیں یہ توفیق دی ہے کہ حق بات کو تم نے مان لیا تو اُس کا شکریہ ادا کرو نہ کہ خواہ مخواہ اُس کی تردید کرو۔ بعض نادان کہہ دیا کرتے ہیں کہ اِس سے عقل بڑھتی ہے لیکن اِس عقل کے بڑھانے کو کیا کرنا ہے جس سے ایمان جاتا رہے۔ دونوں باتوں کا موازنہ کرنا چاہئے۔ اگر ساری دُنیا کی عقل مل جائے اور ایمان کے پہاڑ میں سے ایک ذرّہ بھی کم ہو جائے تو اِس عقل کو کیا کرنا ہے۔ یہ کوئی نفع نہیں بلکہ سراسر خُسران اور تباہی ہے۔ پس یہ بھی آوارگی میں داخل ہے اور مَیں نے کئی دفعہ اِس سے روکا ہے۔ مگر پھر بھی ڈیبیٹس ہوتی رہتی ہیں۔ جس طرح کوڑی کو خارش ہوتی ہے اور وہ رہ نہیں سکتا اِسی طرح اِن لوگوں کو بھی کچھ ایسی خارش ہوتی ہے کہ جب تک ڈیبیٹ نہ کرا لیں چین نہیں آتا اور پھر دینی اور مذہبی مسائل کے متعلق بھی ڈیبیٹیں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ وہ تمام مسائل جن کی صداقتوں کے ہم قائل ہیں یا جن میں سلسلہ اظہارِ رائے کر چُکا ہے ان پر بحث کرنا دماغی آوارگی ہے اور حقیقی ذہانت کے لئے سخت مُضِر ہے۔ مَیں نے سَو دفعہ بتایا ہے کہ اگر اِس کی بجائے یہ کیا جائے کہ دوست اپنی اپنی جگہ مطالعہ کر کے آئیں اور پھر ایک مجلس میں جمع ہو کر یہ بتائیں کہ فلاں مخالف نے یہ اعتراض کیا ہے۔ بجائے اِس کے کہ یہ کہیں کہ مَیں یہ اعتراض فلاں مسئلہ پر کرتا ہوں۔ اگر مولوی ثناء اللہ صاحب یا مولوی ابراہیم صاحب یا کسی اور مخالف کے اعتراض پیش کئے جائیں اور پھر سب مل کر جواب دیں اور خود اعتراض پیش کرنے والا بھی جواب دے تو یہ طریق بہت مُفید ہو سکتا ہے مگر ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ ڈیبیٹوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے

اور انگریزوں کی نقل کی جاتی ہے کہ ''ہاؤس'' یہ کہتا ہے۔ ہماری مجلس شوریٰ میں بھی یہ ''ہاؤس'' کا لفظ داخل ہو گیا تھا مگر مَیں نے تنبیہہ کی اِس پر وہاں سے تو نکل گیا ہے مگر مدرسوں میں رواج پکڑ رہا ہے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اِس طرح کہنے سے اِس بات میں کون سا سُرخاب کا پَر لگ جاتا ہے۔ کے سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ جماعت کی یہ رائے ہے۔ اِس کے یہ معنے ہیں کہ دماغ کو کُفر کی کاسہ لیسی میں لذّت اور سرور حاصل ہوتا ہے۔

پس خدام الاحمدیہ کا فرض ہے کہ اِس قسم کی آوارگیوں کو خواہ وہ دماغی ہوں یا جسمانی روکیں اور دُور کریں۔ کھیلنا آوارگی میں داخل نہیں۔ ایک دفعہ مجھے رؤیا میں بتایا گیا ایک شخص نے خواب میں ہی مجھے کہا کہ فلاں شخص ورزش کر کے وقت ضائع کرتا ہے اور مَیں رؤیا میں ہی اِسے جواب دیتا ہوں کہ یہ وقت کا ضیاع نہیں۔ جب کوئی اپنے قویٰ کا خیال نہیں رکھتا تو دینی خدمات میں پوری طرح حصّہ نہیں لے سکتا۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے سبق دیا تھا کیونکہ مجھے ورزش کا خیال نہیں تھا تو ورزش بھی کام ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مونگریاں اور مُگدر پھیرا کرتے تھے۔ بلکہ وفات سے سال دو سال قبل مجھے فرمایا کہ کہیں سے مونگریاں تلاش کرو جسم میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مَیں نے کسی سے لاکر دیں اور آپ کچھ دن انہیں پھیراتے رہے بلکہ مجھے بھی بتاتے تھے کہ اِس اِس رنگ میں اگر پھیری جائیں تو زیادہ مُفید ہیں۔ پس ورزش انسان کے کاموں کا حصّہ ہے۔ ہاں گلیوں میں بے کار پھرنا، بے کار بیٹھے باتیں کرنا اور بحثیں کرنا آوارگی ہے اور ان کا انسداد خدام الاحمدیہ کا فرض ہے۔ اگر تم لوگ دُنیا کو وعظ کرتے پھرو لیکن احمدی بچے آوارہ پھرتے رہیں تو تمہاری سب کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ پس تمہارا فرض ہے کہ ان باتوں کو روکو، دکانوں پر بیٹھ کر وقت ضائع کرنے والوں کو منع کرو اور کوئی نہ مانے تو اُس کے ماں باپ، اُستادوں کو اور محلّہ کے افسروں کو رپورٹ کرو کہ فلاں شخص آوارہ پھرتا یا فارغ بیٹھ کر وقت ضائع کرتا ہے۔ پہلے پہل لوگ تمہیں گالیاں دیں گے، بُرا بھلا کہیں گے اور کہیں گے کہ آ گئے ہیں خدائی فوجدار اور طنزیہ رنگ میں کہیں گے کہ بس پکے احمدی تو یہ ہیں ہم تو یونہی ہیں لیکن آخر وہ اپنی اصلاح پر مجبور ہوں گے اور پھر تمہیں دُعائیں دیں گے۔ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے جن لوگوں نے میری تربیت میں حصّہ لیا اور کوئی اچھی بات بتائی جب بھی

وہ یاد آتی ہے میرے دل سے اُن کے لئے دُعا نکلتی ہے۔ پس آوارگی کو مٹانا بھی خدام الاحمدیہ کے فرائض میں سے ہے۔ اب چونکہ دیر ہوگئی ہے اِس لئے باقی باتیں پھر بیان کروں گا۔''

(الفضل ۱۱؍ مارچ ۱۹۳۹ء)

۱؎ الفرقان: ۳۱		۲؎ البقرۃ: ۳۶، الاعراف: ۲۰

۳؎ المنجد عربی اُردو صفحہ ۶۴۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء

۴؎ المنجد عربی اُردو صفحہ ۶۴۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۹۴ء

۵؎ ابو داؤد کتاب الادب باب فی المولود یُؤذن فی اُذنِہ (مفہوماً)

۶؎ ابو داؤد کتاب الصلٰوۃ باب مَتٰی یُؤْ مَرُالْغُلامُ بالصلٰوۃ میں عیدگاہوں کا ذکر نہیں۔

۷؎ ایک آبی پرندہ جسے عربی میں نخام، فارسی میں خرچال اور ہندی میں چکوا چکوی کہتے ہیں۔ رنگ سُرخ ہوتا ہے جو رات کو اپنی مادہ سے جُدا رہتا ہے۔ ایک دوسرے کو پکارتا ہے اور اِس کی آواز کے پیچھے جاتا ہے مگر ملاقات سے محروم اور مضطرب رہتا ہے۔ ''سرخاب کا پر لگ جانا'' ایک محاورہ ہے جو دولت پر غرور اور متکبر ہونے یا شان وشوکت میں کسی کو برابر نہ سمجھنے پر بولا جاتا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ)